دیبی: ''کب تک چھپے بیٹھے رہو گے؟''

رما: ''دیکھا چاہیے۔''

دیبی: ''پولیس تمہاری ٹوہ میں ہو گی۔''

رما: ''یہی تو خوف ہے۔''

دیبی دین کو تشویش پیدا ہو گئی۔ رما نے سمجھا، شاید پولیس کے خوف نے اسے فکر مند کر رکھا ہے بولا:

''ہاں تم دیکھتے ہو، دن کو میں بہت کم گھر سے نکلتا ہوں، لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں گھسیٹنا چاہتا۔ میں تو جاؤں گا ہی، تمہیں کیوں الجھن میں ڈالوں۔ سوچتا ہوں کسی ایسے گاؤں میں جا کر رہوں، جہاں پولیس کی ہوا تک نہ ہو۔''

دیبی دین نے غرور سے سر اٹھا کر کہا: ''میرے بارے میں تم کچھ چنتا نہ کرو بھیا! یہاں پولیس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ کسی پردیسی کو اپنے گھر ٹھہرانا کوئی جرم نہیں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کے پیچھے پولیس ہے۔ یہ پولیس کا کام ہے۔ پولیس جانے۔ میں پولیس کا مخبر نہیں۔ گو پندا نہیں۔ جاسوس نہیں۔ ہاں کہیں بڑھیا سے نہ کہہ دینا۔ نہیں اس کے پیٹ میں پانی نہ بچے گا۔''

دونوں ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ تب دیبی دین بولا:

''کہو تو میں تمہارے گھر چلا جاؤں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ میں ادھر ادھر سے سارا حال پوچھ لوں گا۔ تمہارے باپ سے ملوں گا۔ تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا۔ تمہاری گھر والی سے بات چیت کروں گا۔ پھر جیسا مناسب سمجھنا کرنا۔''

رما نے اندر سے خوش ہو کر کہا:

''لیکن کیسے پوچھو گے دادا۔ لوگ کہیں گے تمہیں ان باتوں سے مطلب؟''

دیبی دین نے قہقہہ مار کر کہا:

''بھیا اس سے سہل تو اور کوئی کام ہی نہیں۔ ایک جنیو گلے میں ڈالا اور برہمن بن گئے۔ پھر چاہے ہاتھ دیکھو۔ چاہے کنڈلی بانچو۔ چاہے شگون بچارو۔ سب کچھ کر سکتے ہو۔ تمہاری ماں بھیک لے کر آئے گی۔ اسے دیکھتے ہی کہوں گا، ماتا تیرے پتر کو بڑا کشٹ ہے، اتنا سنتے ہی گھر بھر کے لوگ آ جائیں گے۔ تمہاری گھر والی بھی آئے گی۔ اس کا ہاتھ دیکھوں گا۔ میں ان باتوں میں پکا ہوں۔ کچھ مما لاؤں گا۔ دیکھ لینا۔''

رما اس خیال کے مزے لینے لگا۔ جالپا اس وقت رتن کے پاس دوڑی جائے گی۔ دونوں طرح طرح کے سوالات کریں گی۔ کیوں بابا وہ کہاں گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں نا؟ کب تک آئیں گے؟ کبھی بال بچوں کی بھی سدھ آتی ہے کہ نہیں، وہاں کسی حسینہ کے جال میں تو نہیں پھنس گئے؟''

دیبی دین بولا: ''تو صلاح ہے؟''

رما نے اس کا دل ٹٹولنے کے ارادے سے کہا: ''کہاں جاؤ گے دادا! تکلیف ہوگی۔''

دیبی: ''ماگھ اشنان بھی تو کروں گا۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی چلو۔ کسی دھرم شالہ میں ٹھہر جائیں گے۔ میں رنگ ڈھنگ دیکھ کر تم سے کہہ دوں گا۔ اگر دیکھنا کہ کوئی کھٹکا نہیں ہے تو گھر چلے جانا۔ کوئی کھٹکا ہو تو میرے ساتھ ہی لوٹ آنا۔''

رما نے ہنس کر کہا: ''کہاں کی بات کرتے ہو دادا، سٹیشن پر اترتے ہی کہیں گرفتار ہو جاؤں تو بس۔''

دیبی نے ذمہ داری کی شان سے کہا: ''گرفتار ہو جانا کیا دل لگی ہے؟ مجھ سے کہو میں تمہیں پراگ راج کے تھانے میں لے جا کر کھڑا کر دوں۔ اگر کوئی ترچھی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو مونچھیں منڈوا لوں۔ ایسی بات ہے بھلا۔ سینکڑوں خونیوں کو جانتا ہوں جو اسی شہر میں رہتے ہیں۔ پولیس کے افسروں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ پولیس انہیں جانتی ہے، پھر کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔ روپیہ بڑی چیز ہے۔''

رما نے کچھ جواب نہ دیا، اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ جن باتوں کو وہ ناتجربہ کاری کے باعث محال سمجھتا تھا، انہیں دیبی دین نے بچوں کا کھیل بنا دیا۔ اور بوڑھا شیخی بازوں میں نہیں ہے۔ وہ منہ سے جو کچھ کہتا ہے پورا کر دکھاتا ہے، اس نے سوچا کہ میں سچ مچ دیبی دین کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ یہاں کچھ روپے مل جاتے تو سوٹ بنوا لیتا۔ پھر شان سے جاتا۔ وہ اس وقت کا تصور کرنے لگا جب وہ نیا سوٹ پہنے ہوئے گھر پہنچے گا، اسے دیکھتے ہی گوپی اور شمبھو دوڑیں گے۔ بھیا آئے بھیا آئے۔ دادا نکل آئیں گے۔ اماں کو تو پہلے یقین ہی نہ آئے گا، مگر جب دادا جا کر کہیں گے، ہاں آ گیا، تب وہ آنسو بہاتی ہوئی دروازے کی طرف چلیں گی۔ اسی وقت میں پہنچ کر اماں کے پیروں پر گر پڑوں گا۔

جالپا وہاں نہ آئے گی۔ روٹھی ہوئی بیٹھی رہے گی۔ رما نے دل میں وہ باتیں بھی سوچ لیں جو وہ جالپا کو منانے کے لیے کہے گا۔ اس وقت شاید روپے کا ذکر ہی

نہ آئے۔ روپوؤں کا ذکر کرنے میں سبھی کو تکلف ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے جب کوئی خطا ہو جاتی ہے تو ہم اس کے روبرو اس کا ذکر کر کے اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اور.....چاہتے ہیں اس بات کا اسے دھیان ہی نہ آئے۔ اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں کہ اسے ہماری طرف سے ذرا بھی شک نہ ہو۔ وہ بھول کر بھی یہ نہ سمجھے کہ ان کے دل میں میری طرف سے کدورت ہے۔

دیبی دین نے پوچھا ''کیا سوچ رہے ہو، چلو گے؟''

رما نے دبی زبان سے کہا۔ ''تمہارا اتنا اصرار ہے تو چلوں گا، مگر پہلے تمہیں میرے گھر جا کر پوری پوری خبر لانی پڑے گی۔ اگر میرا من نہ بھرا تو میں لوٹ آؤں گا۔''

دیبی دین نے کہا ''منجور۔''

رما نے شرم سے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ ''ایک بات اور ہے مجھے کچھ کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔''

دیبی دین۔ ''بن جائیں گے۔''

رما: ''گھر پہنچ کر تمہارے روپے دے دوں گا۔''

دیبی: ''اور میں تمہاری گورو دکھشنا بھی وہیں دے دوں گا۔''

رما: ''گورو دکھشنا بھی مجھی کو دینی پڑے گی۔ میں نے تمہیں چار حرف انگریزی پڑھا دی۔ اس سے تمہارا کیا بھلا ہوا۔ تم نے مجھے جو تجربے سکھائے، وہ عمر بھر میرے کام آئیں گے۔ منہ پر بڑائی کرنا خوشامد ہے، لیکن دادا، ماں باپ کے بعد جتنی محبت مجھے تم سے ہے، اتنی اور کسی سے نہیں۔ تم نے ایسے گاڑھے وقت

میں میری باہنہ پکڑی، جب میں منجدھار میں جا رہا تھا۔ ایشور ہی جانے اب تک میری کیا حالت ہوئی ہوتی۔ کس گھاٹ لگتا۔''

دیبی دین نے تمسخر سے کہا۔ ''اور جو کہیں تمہارے دادا مجھے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں تو؟''

رما: ''دادا تمہاری اتنی خاطر کریں گے کہ تم اوب جاؤ گے۔ جالپا تمہاری اتنی خدمت کرے گی کہ جوان ہو جاؤ گے۔''

دیبی دین نے ہنس کر کہا۔ ''تب تو بڑھیا مارے ڈاہ کے جل مرے گی۔ مانے گی نہیں، نہیں میرا جی تو چاہتا ہے کہ ہم دونوں یہاں سے اپنا ڈیرا ڈنڈا لے کر چلتے اور وہیں سر کی تانتے۔ تم لوگوں کے ساتھ جندگانی آرام سے کٹ جاتی، لیکن اس چڑیل سے کلکتہ نہ چھوڑا جائے گا۔ تو بات پکی ہوگئی۔''

رما: ''ہاں پکی ہی ہے۔''

دیبی: ''دکان کھلے تو چلیں کپڑے لا دیں۔ آج ہی سلنے کو دے دیں۔''

دیبی دین کے چلے جانے کے بعد رما بڑی دیر تک سنہرے تصورات میں بیٹھا رہا۔ جن جذبات کو اس نے کبھی اپنے دل میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔ جن کی گہرائی، وسعت اور شدت سے وہ اتنا ہراساں تھا کہ اس میں پھسل کر ڈوب جانے کے خوف سے وہ اپنے دل بے قرار کو ادھر بھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ اسی اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر میں وہ آج پورے اطمینان کے ساتھ تیرنے لگا۔ تصور نے اسے کشش عطا کر دی تھی۔ وہ تربنی کی سیر، وہ الفریڈ کی ہوا خوری، وہ خسرو باغ کے مزے، وہ احباب کی مجلسیں، سب یاد آ آ کر اس کے دل کو گدگدانے لگے۔ رمیش اسے دیکھتے

ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ جائیں گے۔ احباب پوچھیں گے کہاں گئے تھے۔ یار خوب سیر کی۔ رتن اس کی خبر پاتے ہی دوڑی آئے گی اور پوچھے گی، تم کہاں ٹھہرے تھے بابو جی۔ میں نے تو سارا کلکتہ چھان مارا۔ پھر جالپا کی غمگین صورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

یکا یک دیبی نے آ کر کہا: ''دس بج گئے، چلو بازار ہو آئیں۔''

رما چلنے کو تیار ہوا، لیکن دروازہ تک آ کر رک گیا۔

دیبی دین نے پوچھا ''کیوں رک گئے؟''

رما: ''تمہی چلے جاؤ۔ میں جا کر کیا کروں گا؟''

دیبی: ''کیا ڈر رہے ہو؟''

رما: ''ڈر نہیں رہا ہوں مگر کیا فائدہ؟''

دیبی: ''میں اکیلا جا کر کیا کروں گا۔ مجھے کیا معلوم تمہیں کون سا کپڑا پسند ہے۔ چل کر اپنی پسند سے لے لو۔''

رما: ''جو کپڑا اچا ہے لے لینا، مجھے سب پسند ہے۔''

دیبی: ''تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ میں کہتا ہوں پولیس تمہاری طرف تاکے گی بھی نہیں۔''

دیبی دین نے بہت سمجھایا۔ تشفی دی، مگر رما جانے پر راضی نہ ہوا، وہ سوچتا تھا اگر کسی سپاہی نے پکڑ لیا تو دیبی دین کیا کرے گا۔ مانا کہ سپاہی سے اس کی جان پہچان بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سرکاری معاملے میں بھی دوستی کا حق نبھائے، دیبی دین منت خوشامد کر کے رہ جائے گا، جائے گی میرے سر۔ کہیں پکڑا جاؤں تو

پر یاگ کے بدلے جیل جانا پڑے۔ آخر دیبی دین لاچار ہو کر اکیلا ہی گیا۔

دیبی دین گھنٹے بھر میں لوٹا۔ دیکھا رما چھت پر ٹہل رہا ہے۔ بولا ''کچھ جانتے ہو کے بج گئے، بارہ کا عمل ہے۔ آج روٹی نہ بنے گی کیا؟ گھر جانے کی خوشی میں کھانا پینا چھوڑ دو گے۔ یہ دیکھو کپڑوں کا نمونہ لایا ہوں۔ ان میں سے جونسا پسند کرو گے، لے لوں گا؟''

رما نے نمونوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا:

''اتنے مہنگے کپڑے کیوں لائے؟''

دیبی: ''سستے تھے مگر ولایتی تھے۔''

رما: ''تم ولایتی کپڑے نہیں پہنتے؟''

دیبی: ''ادھر بیس سال سے تو نہیں پہنتے۔ ادھر کی بات نہیں کہتا۔ کچھ بیسی وام لگ جاتا ہے مگر روپیہ تو دیس میں رہ جاتا ہے؟''

رما نے شرماتے ہوئے کہا: ''تم اپنے اصول کے بڑے پکے ہو دادا۔''

دیبی دین کے چہرے پر عجیب سی رونق آ گئی۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اکڑ کر بولا:

''جس دیس میں رہتے ہیں۔ جس کا ان جل کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا بھی نہ کریں تو جیسے پر لعنت ہے۔ دو جوان بیٹے اسی سودیشی کی بھینٹ کر چکا ہوں۔ بھیا اکیلے ایسے پٹھے تھے کہ تم سے کیا کہوں۔ دونوں بدیشی کپڑوں کی دکان پر تعینات تھے۔ مجال تھی کہ کوئی گاہک دکان پر آ جائے۔ ہاتھ جوڑ کر، گگیا کر، دھمکا کر، شرما کر، سب کو پھیر لیتے تھے۔''

بجاجوں نے جا کر کمشنر سے فریاد کی۔ سن کر آگ ہو گیا۔ بیس فوجی گورے بھیجے کہ ابھی جا کر بجار سے پہرے اٹھا دو، گوروں نے دونوں بھائیوں سے آ کر کہا۔ یہاں سے چلے جاؤ، مگر وہ اپنی جگہ سے جو بھر بھی نہ ہلے۔ بھیڑ لگ گئی۔ گورے ان پر گھوڑے چڑھا لائے تھے، مگر دونوں جوان کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ جب اس طرح کچھ بس نہ چلا تو سبھوں نے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کیا۔ دونوں بہادر ڈنڈے کھاتے تھے، پر جگہ سے نہ ہلتے تھے۔

جب بڑا بھائی گر پڑا تو چھوٹا اس کی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر دونوں اپنے ڈنڈے سنبھال لیتے تو ان بیسیوں کو مار بھگاتے، لیکن ہاتھ اٹھانا تو بڑی بات ہے سر تک نہ اٹھایا۔ آخر چھوٹا بھی وہیں گر پڑا۔ دونوں کو لوگوں نے ہسپتال اٹھا کر بھیجا۔ اسی رات کو دونوں سدھار گئے۔ تمہارے چرن چھو کر کہتا ہوں بھیا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری چھاتی گج بھر کی ہو گئی ہے... یہی امنگ آتی تھی کہ بھگوان نے اوروں کو پہلے نہ اٹھا لیا ہوتا۔ اس بکھت انہیں بھیج دیتا۔ جب جنا جا چلا ہے تو ایک لاکھ آدمی ساتھ تھا۔ بیٹوں کو گنگا کی بھینٹ کر کے میں سیدھا بجاجے میں پہنچا اور اسی دکان پر کھڑا ہوا جہاں دونوں بیروں کی لہاس گری تھی۔ گاہک کے نام چڑیے کا پوت تک نہ دکھائی دیا۔ آٹھ دن وہاں سے ہلا تک نہیں۔ نہ بھوک تھی، نہ پیاس۔ نویں دن دکانداروں نے قسم کھائی کہ بلایتی کپڑے نہ منگائیں گے۔ تب بجار سے ہٹا۔ تب سے بدیسی دیا سلائی تک گھر میں نہیں لایا۔

رما نے متاثر ہو کر کہا: ''دادا! تم سچے ویر ہو اور وہ دونوں لڑکے بھی سچے جودھا تھے۔''

دیبی دین نے اس انداز سے دیکھا، گویا اپنے کو اس تعریف کا مستحق سمجھتا ہے۔ شہیدوں کی شان سے بولا:

''ان بڑے بڑے آدمیوں کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ یہ تو رونا جانتے ہیں۔ بڑے بڑے دیش بھگتوں کو بلایتی شراب کے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کے گھر میں جا کر دیکھو تو ایک بھی دیسی چیز نہ ملے گی۔ دکھانے کو دس بیس کرتے گاڑھے کے بنوا لیے۔ سب کے سب بھوگ بلاس میں اوندھے ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم دیس کے لیے مرتے ہیں۔ ارے تم کیا دیس کا اودھار کرو گے۔ پہلے اپنا اودھار تو کر لو۔ غریبوں کو لوٹ کر بلایت کا گھر بھرنا تمہارا کام ہے۔ اسی لیے تمہارا اس دیس میں جنم ہوا ہے۔ ہاں روتے جاؤ۔ بلایتی سرابیں اڑاؤ۔ بلایتی موٹریں دوڑاؤ۔ بلایتی مربے اور اچار چکھو۔ بلایتی برتنوں میں کھاؤ۔ بلایتی دوائیاں پیو۔ بلایتی بھاسا بولو۔ بلایتی ٹھاٹ بناؤ، مگر دیس کے نام کو روتے جاؤ اور اس رونے سے کچھ ہوگا۔ رونے سے ماں دودھ پلاتی ہے۔ شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا۔ روؤ اس کے سامنے جس میں دیا دھرم ہو۔ ایک بار یہاں بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ ایک صاحب بہادر کھڑے ہو کر خوب اچھلے کودے۔ جب وہ نیچے آئے تو میں نے پوچھا۔ صاحب! تم دیس کا کیا سوراج دو گے۔ تم بھی بنگلوں میں رہو گے۔ پہاڑوں کی ہوا کھاؤ گے۔ انگریزی ٹھاٹ بنائے گھومو گے۔ اس سوراج سے دیس کا کیا کلیان ہوگا۔ تب بنگلیں جھانکنے لگے۔ تمہیں ہجاروں کی طلب چاہیے۔ گریب کسان کو ایک جون سوکھا چینا بھی نہیں ملتا۔ اس کا لہو چوس کر تو سرکار تمہیں ہی دے دیتی ہے۔ کبھی ان غریبوں کا بھی دھیان آتا ہے۔ ابھی

تمہارا راج نہیں ہے۔ تب تم اتنا اینٹھتے ہو۔ جب تمہارا راج ہوگا تب تو تم غریبوں کو پیس کر پی جاؤ گے۔''

رما مہذب جماعت کی یہ نصیحت نہ سن سکا۔ آخر وہ بھی تو اس جماعت کا ایک فرد تھا۔ بولا:

''یہ بات تو نہیں ہے دادا کہ پڑھے لکھے آدمی کسانوں کا دھیان نہیں کرتے۔ ان میں سے کتنے ہی کسان تھے یا ہیں۔ انہیں اگر یقین ہو جائے کہ ہمارے تکلیف اٹھانے سے کسانوں کا کوئی فائدہ ہوگا اور جو بچت ہوگی وہ کسانوں کے لیے خرچ کی جائے گی۔ تو وہ خوشی سے تھوڑے مشاہرے پر کام کریں، لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ بچت دوسرے ہی ہڑپ کر جاتے ہیں کہ جب دوسروں ہی کو کھانا ہے تو ہم کیوں نہ کھائیں۔''

دیبی: ''تو سوراج ملنے پر ہجار ہجار دو ہجار پانے والے پھر نہیں رہیں گے۔ وکیلوں کی لوٹ نہیں رہے گی۔ پولیس کی لوٹ بند ہو جائے گی۔''

رما: ''تب سب کام کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر کثرت کہے گی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ گھٹا دی جائے تو گھٹ جائے گی۔ کسانوں کے فائدے کے لیے کثرت جتنے روپے مانگے گی، مل جائیں گے۔ کنجی کثرت رائے کے ہاتھ میں رہے گی اور ابھی دس پانچ برس چاہے نہ ہو، لیکن اس کے بعد کثرت رائے کسانوں اور مزدوروں ہی کی ہوگی۔''

دیبی دین نے مسکرا کر کہا:

''بھیا! تم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ میں نے بھی سوچا تھا بھگوان کرے کچھ

دن ہو رجیوں۔ اچھا اب کھانا پکاؤ۔ شام کو چل کر کپڑے درجی کو دے دیں گے۔''

جب اندھیرا ہو گیا تو دیبی دین نے آ کر کہا: ''چلو کپڑے سلوا لیں۔''

رما سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ چہرہ غمگین تھا۔ بولا: ''دادا میں گھر نہ جاؤں گا۔''

دیبی دین نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیوں کیا بات ہوئی۔''

رما کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ بولا:

''کون سا منہ لے کر جاؤں۔ مجھے تو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔''

یہ کہتے کہتے یہ کھل کر رو پڑا۔ وہ درد دل جو اب تک بے ہوش پڑا تھا ٹھنڈے پانی کے یہ چھینٹے پا کر ہوش میں آ گیا تھا اور اس کی آہیں تیر کی طرح اس کے سارے وجود کو چھید ے ڈالتی تھیں۔ اسی نالہ وزاری کے خوف سے وہ اسے چھیڑتا نہ تھا۔ گویا کوئی غم نصیب ماں اپنے بچے کو اس لیے جگاتی ڈرتی ہو کہ وہ فوراً کچھ کھانے کو مانگنے لگے گا۔

(27)

کئی دنوں کے بعد کوئی نو بجے رما کتب خانے سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اسے کئی آدمی کسی شطرنج کے نقشے کا ذکر کرتے ہوئے ملے۔ یہ نقشہ وہاں کے ایک ہندی روزانہ اخبار میں چھپتا تھا۔ اسے حل کرنے کے لیے پچاس روپے انعام کا وعدہ تھا۔ ان آدمیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نقشہ بہت مشکل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے کتنے ہی مشاق شطرنج بازوں نے اسے حل کرنے کی بھرپور کوشش کی

مگر کچھ پیش نہ گئی۔ یکا یک رما کو یاد آیا کہ کتب خانہ میں ایک اخبار پر بہت سے آدمی جھکے ہوئے تھے اور نقشہ کو نقل کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا یہ بات تھی۔

رما کی ان میں سے کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی، مگر وہ نقشہ دیکھنے کے لیے اتنا بے قرار ہوا کہ اس سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔ بولا:

''آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس یہ نقشہ ہے؟''

ان جوانوں نے ایک کمبل پوش دہقان کو یہ سوال کرتے سنا تو سمجھے کوئی عطائی ہوگا۔ ایک نے بے اعتنائی سے کہا:

''ہاں ہے تو، مگر تم دیکھ کر کیا کرو گے؟ یہاں اچھے اچھے غوطے کھا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے، جو شطرنج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اسے حل کرنے کے لیے اپنے پاس سے سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

دوسرا نوجوان بولا: ''دکھا کیوں نہیں دیتے بھائی، کون جانے یہی بے چارے حل کر لیں۔ شاید انہی کی طبیعت لڑ جائے۔''

اس تحریک میں ہمدردی نہیں، طنز تھا۔ اس میں یہ خیال چھپا ہوا تھا کہ ہمیں دکھانے میں تو کوئی عذر نہیں ہے۔ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لو، مگر تم جیسے الو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حل کیا کریں گے؟ ایک دکان میں جا کر انہوں نے رما کو نقشہ دکھایا۔ رما کو فوراً یاد آیا۔ یہ نقشہ کہیں دیکھا ہے، سوچنے لگا کہاں؟''

ایک نے چٹکی لی: ''آپ نے تو حل کر لیا ہوگا؟''

دوسرا بولا: ''اب کیا ہی چاہتے ہیں۔''

تیسرا: ''ذرا دو ایک چال ہمیں بتا دیجیے!''

رما نے برانگیختہ ہوکر کہا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے حل ہی کرلوں گا، مگر ایسا نقشہ میں نے ایک بار حل کیا ہے اور بہت ممکن ہے، اسے بھی حل کرلوں۔ ذرا کاغذ پنسل دیجیے، نقل کرلوں۔''

اس برجستہ جواب نے رما کا وقار قائم کر دیا۔ اسے کاغذ پنسل مل گیا، اس نے نقشہ نقل کیا، شکریہ ادا کیا اور گھر چلا گیا..... گھر پہنچ کر رما نے اس نقشہ پر دماغ لڑانا شروع کیا، لیکن مہروں کی چالیں سوچنے کے عوض وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ نقشہ کہاں دیکھا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد آتے ہی اسے نقشہ کا حل سوجھ جائے گا۔ دیگر جانداروں کی طرح دماغ بھی بہانہ تلاش کیا کرتا ہے۔ رما آدھی رات تک نقشہ کھولے بیٹھا رہا۔ شطرنج کی جو بڑی بڑی معرکے کی بازیاں کھیلی تھیں، وہ سارے نقشے اسے یاد تھے، مگر یہ نقشہ کہاں دیکھا؟

دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ اہا، راجہ صاحب نے یہ نقشہ دیا تھا۔ لگاتار تین دن دماغ لڑانے کے بعد اس نے اسے حل کیا تھا، پھر تو اسے ایک ایک چال یاد آ گئی۔ ایک ہی لمحہ میں نقشہ حل ہو گیا۔ اس نے مسرت کے نشہ میں زمین پر دو تین قلابازیاں کھائیں، مونچھوں کو تاؤ دیا۔ آئینہ میں منہ دیکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دیبی دین ابھی آگ سلگا رہا تھا کہ رما خوش خوش آ کر بولا: ''دادا جانتے ہو صداقت اخبار کا دفتر کہاں ہے؟''

دیبی: ''جانتا کیوں نہیں ہوں۔ یہاں کون اخبار ہے، جس کا پتا مجھے معلوم نہ ہو۔ صداقت کا ایڈیٹر ایک رنگیلا آدمی ہے، جو ہر دم منہ میں پان بھرے رہتا ہے،

مگر ہے ہمت کا دھنی۔ دو بار جیل ہو آیا ہے۔''

رما: ''آج ذرا وہاں تک جاؤ گے؟''

دیبی دین نے عذر کیا: ''مجھے بھیج کر کیا کرو گے؟''

رما: ''کیا بہت دور ہے؟''

دیبی: ''نہیں دور تو نہیں ہے۔''

رما: ''پھر بات کیا ہے؟''

دیبی دین نے خطاوارانہ انداز سے کہا:

''بات کچھ نہیں ہے۔ بڑھیا بگڑتی ہے۔ اسے بچن دے چکا ہوں کہ سودیشی بدیشی کے جھگڑے میں نہ پڑوں گا۔ نہ کسی اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کا دیا کھاتا ہوں تو اس کا حکم بھی بجانا پڑے گا۔''

رما نے مسکرا کر کہا: ''واہ تم دل لگی کرتے ہو۔ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اس اخبار میں شطرنج کا ایک نقشہ چھپا ہے، جس پر پچاس روپے انعام ہے، جواب چھپ جائے تو مجھے وہ انعام مل جائے۔ اخباروں کے دفتر میں اکثر خفیہ پولیس کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی ڈر ہے، نہیں تو میں خود چلا جاتا۔''

دیبی دین: ''تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

رما: ''تو پھر کیا ڈاک سے بھیج دوں؟''

دیبی: ''نہیں ڈاک سے کیا بھیجو گے۔ سادہ لفافہ ادھر ادھر ہو جائے تو تمہاری محنت اکارت جائے۔ رجسٹری کراؤ تو کہیں پرسوں پہنچے گا۔ کل اتوار ہے کسی اور نے جواب بھیج دیا تو انعام وہ مار لے جائے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اخبار والے

دھاندلی کر بیٹھیں اور تمہارا جواب اپنے نام سے چھاپ کر روپے جمع کر لیں۔''

رما نے شش و پنج میں پڑ کر کہا: ''تو میں ہی چلا جاؤں گا۔''

دیبی: ''تمہیں میں نہ جانے دوں گا۔ کہیں پھنس جاؤ گے، بس۔''

رما: ''پھنسنا تو ایک دن ہے ہی، کب تک چھپا رہوں گا؟''

دیبی: ''تو جب پھنسو گے، تب دیکھی جائے گی۔ لاؤ میں چلا جاؤں۔ بڑھیا سے کوئی بہانہ کروں گا۔''

یہ کہتے ہوئے دیبی دین نے اپنا کالا کمبل اوڑھا، رما سے لفافہ لیا اور چل دیا۔

بڑھیا ساگ بھاجی لینے منڈی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں سر پر ٹوکری رکھے اور ایک بڑا سا ٹوکرا مزدور کے سر پر رکھوائے آئی۔ پسینہ سے تر تھی۔ آتے ہی بولی، کہاں گئے؟

رما نے بہانہ کیا: ''مجھے تو نہیں معلوم۔ ابھی اسی طرف گئے ہیں۔''

بڑھیا نے مزدور کے سر سے ٹوکرا اتروایا اور زمین پر بیٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی پنکھیا جھلتی ہوئی بولی:

''چرس کی چاٹ لگی ہوئی ہوگی اور کیا؟ میں مر مر کر کماؤں اور یہ بیٹھے بیٹھے موج اڑائیں، چرس پئیں۔''

رما جانتا تھا، دیبی دین چرس پیتا ہے، لیکن بڑھیا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بولا:

''کیا؟ چرس پیتے ہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔''

بڑھیا نے پیٹھ کی ساڑھی ہٹا کر اسے پنکھے کی ڈنڈی سے کھجاتے ہوئے کہا:

''ان سے کوئی نشہ چھوٹا ہے؟ چرس یہ پئیں، گانجہ یہ پئیں، سراب انہیں چاہیے،

بھنگ نہیں چاہیے۔ ہاں ابھی تک افیم نہیں کھائی۔ یا رام جانے کھاتے ہوں، میں کون ہر دم دیکھتی رہتی ہوں۔ میں تو سوچتی ہوں...... آگے کیا ہو۔ ہاتھ میں چار پیسے رہیں گے تو پرائے بھی اپنے ہو جائیں گے، مگر اس بھلے آدمی کو رتی بھر پھکر نا ہیں ہوتی۔ کبھی تیرتھ ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ بھگوان اٹھا لیتے تو گلا چھوٹ جاتا۔ تب یاد کریں گے لالہ۔ تب جگّو کہاں ملے گی، جو ٹکا ٹکا کے گھر ے اڑانے کو دیا کرے گی۔ تب سر پر ہاتھ رکھ کر نہ روئیں تو کہہ دینا۔ کوئی کہتا تھا (مزدور سے) کے پیسے ہوئے تیرے؟''

مزدور نے بیڑی جلاتے ہوئے کہا: ''بوجھا دیکھ لو وائی، گردن ٹوٹ گئی۔''

جگّو نے بے رحمانہ انداز سے کہا: ''ہاں ہاں گردن ٹوٹ گئی۔ بڑے نازک ہو نا؟ یہ لے، کل پھر چلے آنا۔''

مزدور چلا گیا تو بڑھیا کو حساب کی یاد آئی۔ رما سے بولی: ''بھیا! جرا آج کا کھر چا تو ٹانک لو، بجار میں تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔''

بڑھیا چھابڑیوں میں چیزیں لگا لگا کر رکھتی جاتی تھی اور حساب بھی لکھاتی جاتی تھی۔ آلو، ٹماٹر، کدو، کریلے، پالک، سیم، سب چیزوں کا تول اور دام سے یاد تھا۔ رما سے دوبارہ پڑھوا کر سنا تب اسے اطمینان ہوا۔ ان کاموں سے فرصت پا کر اس نے اپنی چلم بھری اور مونڈھے پر بیٹھ کر پینے لگی، لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمباکو کا مزا لینے کے لیے نہیں، دل جلانے کے لیے پی رہی ہے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر بولی:

''دوسری عورت ہوتی تو گھڑی بھر ان کے ساتھ نباہ نہ ہوتا۔ گھڑی بھر۔ پہر

رات سے چکی میں جت جاتی ہوں اور دس بجے رات تک دکان پر بیٹھی ستی ہوتی رہتی ہوں۔ کھاتے پیتے بارہ بجتے ہیں۔تب جا کر چار پیسے دکھائی دیتے ہیں اور میں جو کچھ کماتی ہوں، اسے یہ نشے میں اڑا دیتا ہے۔ رات کوٹھڑی میں چھپا کر رکھوں، مگر اس کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔ کبھی ایک آدھ چیز بنوا لیتی ہوں تو وہ آنکھوں میں گڑنے لگتی ہے۔ بھگوان نے لڑکوں کا سکھ بھوگنا نہیں لکھا تھا تو کیا کروں۔ چھاتی پھاڑ کر مر جاؤں؟ مانگنے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔ سکھ بھوگنا لکھا ہوتا تو نوجوان بیٹے کیوں چل دیتے اور اس پیکڑ کے ہاتھوں میری یہ سانت ہوتی۔ اسی نے سودیشی کے جھگڑے میں پڑ کر میرے لالوں کی جان لی۔ آؤ اس کوٹھڑی میں بھیا۔ تمہیں مگدر کی جوڑی دکھاؤں۔ دونوں اس جوڑی کے پانچ سو ہاتھ پھیرتے تھے۔

اندھیری کوٹھڑی میں جا کر رما نے مگدر کی جوڑی دیکھی۔ ان پر وارنش تھی۔ صاف ستھری گویا کسی نے ابھی پھیر کر رکھ دیا۔ بڑھیا نے غرور آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا:

''لوگ کہتے تھے یہ جوڑی مہابامن کو دے دے، تجھے دیکھ دیکھ کر قلق ہوگا۔ میں نے کہا یہ جوڑی میرے لالوں کی جوڑی ہے۔ یہی میرے دونوں بیٹے ہیں۔''

آج رما کے دل میں بڑھیا کی جانب سے بے اندازہ عقیدت پیدا ہوئی۔ کتنا زاہدانہ توکل ہے۔ کتنی پاکیزہ محبت ہے۔ جس نے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو زندگی عطا کر رکھی ہے۔ رما نے جگو کو حرص اور طمع میں ڈوبی ہوئی پیسے پر جان دینے والی نازک جذبات سے عاری سمجھ رکھا تھا، آج اسے معلوم ہوا کہ ضعیفہ کا کتنا نازک، کتنا

دلیر اور کتنا مہر پرور دل ہے۔

بڑھیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آج دونوں کے دل رشتۂ محبت میں مربوط تھے۔ ایک طرف مادرانہ شفقت تھی، دوسری طرف فرزندانہ سعادت مندی، وہ کدورت جو اب تک نادانستہ طور پر دونوں کو الگ کیے ہوئے تھی۔ آج یکا یک مٹ گئی۔

بڑھیا نے کہا: ''منہ ہاتھ دھولیا ہے بیٹا، بڑے میٹھے سنترے لائی ہوں۔ ایک لے کر چکھو تو۔''

رما نے سنترہ کھاتے ہوئے کہا: ''آج سے میں تمہیں اماں کہا کروں گا۔''

بڑھیا کی ٹھنڈی، خشک، بے نور اور بخیل آنکھوں سے موتی کے سے دو قطرے نکل پڑے۔ اتنے میں دیبی دین دبے پاؤں آ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا نے تڑپ کر پوچھا: ''اتنے سویرے کدھر سواری گئی تھی سرکار کی؟''

دیبی دین نے سادگی سے مسکرا کر کہا: ''کہیں نہیں۔ جرا ایک کام سے چلا گیا۔''

''کیا کام تھا جرا میں بھی سنوں یا میرے سننے کے لائق نہیں ہے؟''

''پیٹ میں درد تھا۔ بید جی کے پاس چورن لینے چلا گیا تھا۔''

''جھوٹے ہو تم۔ اڑوس اسے جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ تم چرس کی ٹوہ میں گئے تھے۔''

''نہیں، تیرے سر کی قسم تو جھونٹ مونٹ مجھے بدنام کرتی ہے۔''

''تو پھر کہاں گئے تھے تم؟''

''بتا تو دیا رات کو کھانا دو گورجیا وہ کھا گیا تھا۔ سو پیٹ پھول گیا اور کھٹی کھٹی

ڈکاریں آنے لگیں۔''

''جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ تمہارا منہ صاپھ کہے دیتا ہے کہ یہ بہانہ ہے۔ تم چرس یا گانجے کی ٹوہ میں گئے تھے۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ تمہیں اس بڑھاپے میں نسے کی سوجھتی ہے۔ یہاں میری مرن ہوئی جاتی ہے۔ سویرے کے گئے گئے نو بجے لوٹے ہیں۔ جیسے کوئی ان کی یہاں رنڈی ہے۔''

دیبی دین نے ایک جھاڑو لے کر دکان میں جھاڑو لگانا شروع کیا۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور پوچھا: ''تم اب تک تھے کہاں؟ جب تک یہ نہ بتاؤ گے، گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔''

دیبی دین نے سٹپٹا کر کہا: ''کیا کرے گی پوچھ کر ایک اخبار کے دفتر میں گیا تھا، جو چاہے سزا دے۔''

بڑھیا نے ماتھا ٹھونک کر کہا: ''تم نے پھر وہی لت پکڑی، تم نے کان نہ پکڑا تھا کہ اب پھر کبھی ادھر نہ جاؤں گا۔ بولو یہی منہ نہ تھا کہ کوئی اور؟''

''تو بات تو سمجھتی نہیں، بگڑنے لگتی ہے۔''

''خوب سمجھتی ہوں۔ اخبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لے جاتے ہیں۔ آج بیس سال سے دیکھ رہی ہوں۔ کیا بڑھاپے میں جیل کی روٹیاں توڑو گے؟''

دیبی دین نے ایک لفافہ رمانا تھ کو دے کر کہا: ''یہ روپے ہیں۔ بھیا گن لو۔ یہ روپے وصول کرنے گیا تھا۔ جی نہ مانتا ہو تو آدھے لے لے۔''

بڑھیا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: ''اچھا تو تم اپنے ساتھ بھیا کو بھی ڈبونا چاہتے

ہو؟ تمہارے روپے میں آگ لگا دوں گی۔ تم روپے مت لینا بھیا، مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اب سیت میں آدھی نہیں ملتے تو سب لالچ دے کر لوگوں کو پھانستے ہیں۔ بازار میں پہرا دلا دیں گے۔ عدالت میں گواہی کرا دیں گے۔ پھینک دو اس کے روپے، جتنے روپے چاہو مجھ سے لے جاؤ۔''

جب رمانا تھ نے سارا قصہ کہا تو بڑھیا کی تشفی ہوئی۔ چہرے کی وہ تندی غائب ہوگئی۔ خوش ہوکر بولی: ''اس میں سے میرے لیے کیا لاؤ گے بیٹا؟''

رمانا تھ نے لفافہ اس کے سامنے رکھ کر کہا: ''تمہارے ہی روپے تو ہیں اماں، میں روپے لے کر کیا کروں گا؟''

''پھر کیوں نہیں گھر بھیج دیتے؟''

''میرا گھر یہی ہے اماں، کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔''

بڑھیا کا حسرت نصیب دل شگفتہ ہوگیا۔ اس فرزندانہ محبت کے لیے کتنے دنوں سے اس کی روح بے قرار تھی۔ اس حسین دل میں محبت کا جو خزانہ جمع ہوگیا، وہ سب ماں کے سینے میں جمع ہونے والے دودھ کی طرح بیٹے پر نثار ہونے کے لیے للچا اٹھا۔

بڑھیا نے نوٹوں کو گن کر کہا: ''پچاس ہیں بیٹا، پچاس مجھ سے اور لے لو، چائے کا پتیلا رکھا ہوا ہے، چائے کی دکان کھول لو۔ یہیں ایک طرف چار پانچ موڑھے اور ایک میز رکھ لینا۔ دو دو گھنٹہ سانجھ سویرے بیٹھ جایا کرو گے تو کچھ بھر کو مل جائے گا۔''

دیبی دین بولا: ''تب چرس کے پیسے میں اس دکان سے لے لیا کروں گا؟''